ختم نبوت.................حکمت، ضرورت اور نتیجہ

ثاقب اکبر☆

ختم نبوت اور کمالِ عقل انسانی:

ختم نبوت کے حوالے سے یہ بحث بہت بنیادی ہے کہ کیا یہ عقل انسانی کے بلوغ اور کمال کی طرف اشارہ ہے۔خود اس سوال کے اندر ایک سوال اور پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ کیا کمالِ عقل نبوت اور وحی کی ضرورت سے بے نیاز کر دیتا ہے؟ یعنی یہاں اس بحث کا دروازہ کھلتا ہے کہ کیا نبوت کی ضرورت انسانی شعور کے دورِ ناپختگی میں ہے اور جب انسانی شعور پختہ ہو جائے تو پھر اسے نبوت اور وحی کی راہنمائی کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ یہ ایک بڑی معرکۃ الآرا بحث ہے۔ اسے کھولنے کے لیے ہم مثال کے طور پر یہ عرض کرتے ہیں کہ بچپن میں ماں باپ اپنی اولاد کو حکم دیتے ہیں اور اس کی دلیل کم تر بیان کرتے ہیں۔ بچہ جوں جوں بڑا ہونے لگتا ہے تو ماں باپ اپنے حکم کی دلیل اور وجہ بھی بیان کرنے لگتے ہیں۔ جب بچہ عقلی لحاظ سے رشد و کمال کو پہنچ جاتا ہے تو پھر ایسا مرحلہ آ جاتا ہے جب بالعموم روزمرہ امور میں ماں باپ کی راہنمائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگرچہ وہ ان کے تجربات سے پھر بھی استفادہ کر سکتا ہے۔ کیا انسانوں کے لیے نبوت کا مسئلہ بھی ایسا ہی ہے؟ یعنی جب ابھی بشریت کا دورِ اولین تھا تو اس کی انگلی پکڑ کر اسے راستہ چلانے کی ضرورت تھی۔ اسے دلیل بتائے بغیر امر و نہی کیا جانا چاہیے تھا۔ گویا آسمان سے اس کے لیے قوانین اور احکام کے بیان کی ضرورت تھی جو انبیاء کے توسط سے اس تک پہنچتے رہے اور جوں جوں مجموعی طور پر انسانی شعور پختہ ہوتا چلا گیا تو اسے اس کی ضرورت کم تر پیش آنے لگی۔ یہاں تک کہ انسانی معاشرہ کمال کی اس منزل تک آ پہنچا کہ اب اسے آسمانی ہدایت اور راہنمائی کی ضرورت نہ تھی جس کی وجہ سے سلسلۂ نبوت کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔

اگر بات کو اس طرح سے درست مان لیا جائے تو پھر آج کے انسان کو کسی نبی کی تعلیمات کی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا تمام آسمانی کتابیں بھی اس صورت میں دورِ قدیم کے انسانوں کو دی گئی راہنمائی کے لیے ایک ریکارڈ اور دستاویز سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

جو لوگ ختم نبوت کے اس مفہوم کے قائل ہوئے ہیں ان میں اور مغرب کے بعض ایسے فلاسفہ میں عملاً کوئی

☆محقق، دانشور، شاعر، صدر نشین، البصیرہ، اسلام آباد

فرق نہیں کہ جو یہ کہتے ہیں کہ مذہب دورِ علم سے ماقبل کے انسانوں کا ساختہ و پرداختہ ہے۔اسی طرح وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ انبیاء مخلص انسان تھے لیکن انسانی شعور کی ناپختگی کی وجہ سے انھیں انسانوں کی راہنمائی کے لیے نبوت اور آسمانی ہدایت کے حامل ہونے کا دعویٰ کرنا پڑا اور آج جب کہ انسان عقلی لحاظ سے رشد کے دور میں داخل ہوگیا ہے، اسے ضرورت نہیں رہی کہ آسمانی ہدایت یا وحی کے نام پر اس کی بھلائی کی کوئی بات اسے پیش کی جائے کیونکہ وہ اپنا اچھا برا بہتر طور پر سمجھنے لگا ہے۔

ختم نبوت اور معارفِ الٰہی کی تکمیل:

ہماری رائے میں اسلام کا تصورِ ختمِ نبوت اس تعبیر وتشریح سے ہم آہنگ نہیں ہے اگرچہ اسلام بھی ختمِ نبوت کے لیے دین کی تکمیل و تتمیم کا مدعی ہے۔جیسا کہ قرآن حکیم کی یہ مشہور آیت ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا.(۱)

آج کے دن میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمھارے لیے اس اسلام کے دین ہونے پر راضی ہوگیا۔

یہ آیت اس امر کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ تمام انبیاء کا دین اسلام ہی تھا اور دین اسلام کے معارف رفتہ رفتہ انسانیت تک پہنچتے رہے۔یہاں تک کہ آخری پیغمبر تک معارف کی اس ترسیل کا سلسلہ مکمل ہوگیا۔تمام انبیاء کا دین اسلام ہی تھا اس کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامَ.(۲)

بیشک اللہ کے نزدیک دین اسلام ہی ہے۔

آیۂ تکمیل دین جہاں دینی معارف کی تکمیل کی طرف اشارہ کرتی ہے وہاں کمال نبوت کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کیونکہ کامل ترین معارف کے حامل نبی کی نبوت کو بھی مقام کمال پر ہونا چاہیے۔جہاں تک انسانی معاشرے اور انسانی عقل کے درجۂ کمال تک پہنچنے کا تعلق ہے نظریۂ ختم نبوت لازمی طور پر اس کی حکایت کرتا ہے لیکن اس معنی میں نہیں جس کا سطورِ بالا میں ذکر کیا گیا ہے۔

قرآن کا محفوظ رہنا ایک اور دلیل ہے:

اس سلسلہ میں قرآنی نظریہ قرآن ہی سے ثابت ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ قرآن کریم کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ .(۳)

یقیناً ہم نے اس ذکر کو نازل کیا ہے اور بیشک ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن ہمیشہ کے لیے محفوظ رہنے کے لیے اترا ہے۔ نیز اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انسانوں کو ہمیشہ ہمیشہ اس کی ضرورت رہے گی۔ گویا محمد مصطفیؐ کی نبوت اور آپؐ کے توسط سے پہنچنے والا دین کامل باقی رہے گا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آنخضرتؐ کے خاتم النبینؐ ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اب انسانوں کو نبی، نبوت اور وحی کی ضرورت باقی نہیں رہی بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وحی اور آسمانی پیغام اور تعلیم کے محفوظ ہو جانے کی صورت میں کسی اور صحیفۂ ہدایت کی انسانوں کو ضرورت نہیں۔ آخری نبی کی تعلیمات کا استمرار اور ان کی بقا انسانوں کو مزید کسی نبی، نبوت اور انسانی ہدایت سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

قرآن حکیم کے محفوظ رہنے کا نظریہ بھی انسانی معاشرے کے ارتقاء اور رشد کی گواہی دیتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اب انسانی معاشرہ ایسے مرحلے میں داخل ہو گیا ہے کہ وہ آسمانی ہدایت کے ایسے صحیفے کی حفاظت کرسکتا ہے جو الٰہی معارف کی کامل صورت کا حامل ہے۔ خارج پر بھی ایک نظر ڈالی جائے تو یہی حقیقت ثابت ہوتی ہے۔ قرآن حکیم کی تاریخ جتنی صاف ہے اور جس طرح سے یہ نسل در نسل سینوں سے سینوں میں منتقل ہوا ہے اور جس طرح سے اس کی حامل امت مقامی اور زمانی اعتبار سے مسلسل چلی آ رہی ہے اس کے بارے میں تاریخ جاننے سے بھی ایک محقق بے نیاز ہو جاتا ہے چہ جائیکہ نوبت نسخوں کے تقابلی مطالعے تک جا پہنچے۔ ہر دور میں اس کے متن کے حفاظ اتنی کثرت سے موجود رہے ہیں کہ جس کی مثال نہ امتوں میں ملتی ہے نہ ملتوں میں۔

معراجِ مصطفیؐ اور ختم نبوت:

ختم نبوت کے مسئلے کو سمجھنے کے لیے حضرت رسول اکرمؐ کے مقامِ معنوی و روحانی اور انسانیت میں آپؐ کے درجۂ کمال پر بھی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ انسان اپنی صلاحیت اور منصب کے لحاظ سے اشرف المخلوقات ہے اور اس اشرفیت کا کامل ترین ظہور آنخضرتؐ کی ذاتِ والا صفات میں ہوا ہے۔ انسانی شرف کی ممکنہ بلند ترین چوٹی پر آپؐ جا پہنچے ہیں۔ آپؐ کی معراج بھی اسی امر کی طرف اشارہ ہے۔ ایک لحاظ سے علامہ اقبالؒ نے معراج مصطفویؐ کا تذکرہ کرتے ہوئے اسی پہلو کی نشاندہی کی ہے۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیؐ سے مجھے　　کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں (۴)

انسانی ملکات و استعدادات اپنے اعلیٰ ترین امکان میں آنخضرتؐ کی ذات میں مجسم ہو چکی ہیں۔ یہ مقام اور معارف الٰہی کا کمال آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ اللہ اور ملائکہ کا آنخضرتؐ پر درود بھیجتے رہنا یعنی تمام تر کائنات کے باطن کا مسلسل آپؐ کے مقام بلند پر آفرین و تحسین کہتے رہنا اور پھر تمام پاک باطن انسانوں کو بھی دعوت دینا کہ وہ بھی باطنِ کائنات کی آواز میں اپنی آواز ملائیں اسی حقیقت کی طرف ایک اور اشارہ ہے۔ ایسے

وجودِ ذی جود کے ظہور کے بعد اس کے اسوۂ کاملہ کا صفحاتِ تاریخ سے محو ہو جانا تو کائنات کے عظیم الٰہی منصوبے کے ناکام ہو جانے کے برابر تھا لہٰذا ایسا اہتمام کیا جانا ضروری تھا کہ آنحضرتؐ کا اسوۂ کاملہ اپنی تمام تر تجلیوں اور رعنائیوں کے ساتھ باقی رہے اور ایسا ہی ہوا ہے۔ آپؐ کے کردار و رفتار اور اسوہ و سیرت کا بلند مینار کائنات میں ہر طرف ہدایت کی کرنیں بکھیرتے ہوئے پوری تابانیوں کے ساتھ موجود ہے۔ اس صورت میں اگر نبی کی ضرورت ایک زندہ و جاوید انسانی نمونے کے لیے ہوتی ہے تو وہ باقی ہے۔ آپؐ کا ذکر کل بھی رفیع تھا اور آج بھی رفیع ہے اور اللہ کا وعدہ برحق ہے:

وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ.(۵)

اور ہم نے آپ کے ذکر کو بلند کیا۔

آنحضرتؐ کے وارثان علم:

آنحضرتؐ کے کشادہ سینے پر اترنے والے معارف کی تابانیوں نے آپؐ کی امت میں بھی حاملین معارف الٰہی کو وجود بخشا۔ رسول اللہ خود فرما چکے ہیں کہ

میری امت کے علماء انبیاء بنی اسرائیل سے افضل ہیں۔(۶)

ظاہر ہے یہ عام علماء و فقہا کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ''**رٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ**''(۷) ہیں۔ آپؐ کی امت میں اور آپؐ کے شاگردانِ خاص میں امیر المومنین حضرت علیؑ کا مقامِ بلند ایسا ہے کہ اگلوں اور پچھلوں میں جس کی مثال نہیں ملتی۔ امام علیؑ کے علاوہ تاریخ بشریت میں اس دعوے میں صادق کوئی نہیں گزرا کہ:

سلونی سلونی قبل ان تفقدونی(۸)

پوچھو پوچھو مجھ سے اس سے پہلے کہ میں تم سے جدا ہو جاؤں۔

اسلام میں ایسی ہستی کا وجود آنحضرتؐ کے معارف کاملہ کے کمال کا مظہر ہے۔ آسمانی صحیفے کے لفظوں اور متن کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ایسی ہستیوں کے وجود نے اس کے مطالب و مفاہیم کی حفاظت کا بھی بندوبست کر دیا۔ آنحضرتؐ پہلے ہی اس امر کی نشاندہی کر چکے تھے، آپؐ نے امام علیؑ سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا:

تُقَاتِلُ عَلَی التَّاوِیْلِ کَمَاقَاتَلْتُ عَلَی التَّنْزِیْلِ

جس طرح میں نے تنزیل قرآن پر جنگ کی ہے تم تاویل قرآن پر جنگ کرو گے۔(۹)

علاوہ ازیں اپنی عترت کو قرآن کے ساتھ قرار دے کر قرآن کے مقاصد کی حفاظت ہی کے بندوبست کی

طرف اشارہ فرمایا:

انی تارک فیکم الثقلین اما ان تمسکتم بهما لن تضلوا کتاب الله وعترتی أهل بیتی فا انهما من لن یفترقا حتی یردا علیّ الحوض.(١٠)

میں تم میں دو ایسی گرانقدر چیزیں چھوڑے جا تا ہوں جن سے وابستہ رہو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت اہل بیت اور یہ دونوں آپس میں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس آ پہنچیں

اس سے دو نتیجے واضح طور پر برآمد ہوتے ہیں:

١۔ قرآن کے متن کے ساتھ ساتھ اُس کے معارف ومفاہیم کی حفاظت کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔

٢۔ رسول اسلامؐ پر کامل ہونے والے دین اسلام کے معارف میں وہ قوت موجود ہے جس کی برکت سے نہایت بلند مرتبہ با کمال لوگوں کا ظہور ہوتا رہے گا جن میں سے بعض انبیائے بنی اسرائیل جیسے یا بعض اُن سے بھی بلند مرتبہ ہوں گے۔

ان دونوں نتائج کی مدد سے تیسرا نتیجہ بھی آسانی سے نکل آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں کسی نئے نبی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اب بھی با کمال لوگ پیدا ہوتے ہیں:

ہماری اس گفتگو سے اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ کیا ختم نبوت اس امر کی دلیل ہے کہ اب بڑے با کمال لوگوں کی پیدائش کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے مطالب بالا کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ نہیں بلکہ با کمال لوگوں کی پیدائش وظہور جاری وساری ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی دور میں ایسے افراد نسبتاً زیادہ ہوں اور کسی دور میں کم۔

یہ گفتگو ہمیں ایک اور مرحلے میں بھی داخل کر دیتی ہے اور وہ یہ کہ کیا انسانی مقام کی بلندی فقط نبی ہونے میں منحصر ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ نبوت ایک بڑا منصب ہے اور نبی بڑے انسان ہی ہوتے تھے لیکن اس امر پر کوئی عقلی دلیل نہیں ہے کہ غیر نبی روحانی ومعنوی مقام میں بلند مقامات کا حامل نہیں ہو سکتا۔(١١) ختم نبوت کے نظریے کو عظیم و با کمال انسانوں کی پیدائش کے خاتمے کا نظریہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ ہماری رائے میں محمد مصطفیؐ جیسے عظیم ترین انسان کی پیدائش اور آپؐ کی تعلیمات ومعارف کے نتیجے میں عظیم روحوں کا ظہور عین فطری اور عقلی ہے۔ کامل ترین معارف کے نتیجے میں کامل ترین پیروانِ خاتم النبیین کو ظہور میں آنا چاہیے۔ ختم نبوت تو کمال آفریں ہے نہ کہ زوال انسانی کی دلیل۔ سورۂ واقعہ کی چند آیات ملاحظہ ہوں۔

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ O اُوْلٰٓئِکَ الْمُقَرَّبُوْنَ O فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ O

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ O وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ O(۱۲)

اور سبقت لے جانے والے وہی جو سبقت لے جانے والے ہیں، یہی تو وہ لوگ ہیں جو اللہ کی قربت پا لینے والے ہیں، یہ نعمتوں کے باغات میں ہوں گے، پہلوں میں ان میں سے ایک بڑی جماعت ہے اور پچھلوں میں ایسے تھوڑے ہیں۔

احکام کی دائمی یا غیر دائمی حیثیت

ختم نبوت کے نظریے سے منسلک ایک بحث شریعت کے احکام کی دائمی یا غیر دائمی حیثیت بھی ہے۔ اس سلسلے میں یہ جاننا ضروری ہے کہ انبیاء کی تعلیمات کا محور زیادہ تر جہان ماورائے مادہ پر ایمان رہا ہے۔ ان کی اخلاقی تعلیمات بھی اسی ایمان سے پھوٹتی ہیں۔ الٰہی و کائناتی معارف اپنی گہرائی میں تو مختلف ہو سکتے ہیں لیکن اپنی حقیقت کے لحاظ سے مختلف نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح اخلاقی تعلیمات بھی تمام انبیاء کی ایک جیسی رہی ہیں۔ عبادات سے متعلق انبیاء کی تعلیمات اپنی روح کے لحاظ سے تو مختلف نہیں ہو سکتیں لیکن اپنے تجسم و تشکل میں قدرے مختلف ہو سکتی ہیں۔ ان سب باتوں کی چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

(۱) اس کائنات کا کوئی مالک ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے وہ اکیلا ہے، قادر ہے اور سمیع و علیم ہے۔ انبیاء کی تعلیمات کا آغاز اس عقیدے یا نظریے سے ہوتا ہے۔ اس بارے میں کوئی نبی مختلف بات نہیں کر سکتا۔ ایمانیات کی ابتدا بھی، انتہا بھی اور روح بھی یہی عقیدہ ہے۔

(۲) سچ اچھی چیز ہے اور جھوٹ بری چیز ہے۔ ایفائے عہد اچھی چیز ہے اور عہد شکنی بری چیز ہے۔ ہمسایوں کے دکھ سکھ میں شریک رہنا چاہیے۔ بھوکے کو کھانا کھلانا بہت اچھی اور پسندیدہ بات ہے۔ یہ اور اس جیسی دیگر اخلاقی اور سماجی تعلیمات سب انبیاء میں مشترک رہی ہیں۔ ان میں تبدیلی کا کوئی امکان نہیں۔

(۳) عبادت اللہ کی کرنا چاہیے، یہ بات تو نہیں بدل سکتی البتہ عبادت کی شکل و صورت، اوقات وغیرہ میں فرق ممکن ہے۔ اسی طرح مختلف انبیاء کے دور میں قبلہ بھی مختلف ہوا ہے لیکن ان تبدیلیوں سے اصل دین میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا یہاں تک کہ قرآن حکیم نے قبلہ کی تبدیلی کا حکم دیتے ہوئے اس امر کو واضح کر دیا:

فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ(۱۳)

تم جدھر بھی رخ کرو اسی طرف اللہ کا چہرہ ہے

احکام میں تبدیلی کا اصل میدان ''معاملات'' ہیں۔ انسانی سوسائٹی کو چلانے کے لیے جن روزمرہ احکام کی ضرورت پڑتی ہے ان میں تبدیلی کا امکان ہی نہیں ضرورت بھی پڑتی رہتی ہے اور گاہے تبدیلی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ وہ انبیاء جن کو معاشرے میں کچھ اقتدار حاصل ہوا وہ اس شعبے میں بھی قوانین بیان کرتے رہے۔

یہ قوانین انسانی تجربات کی روشنی میں تشکیل پاتے تھے۔

انبیائے کرام الٰہی تعلیمات کی روشنی میں ان قوانین کا جائزہ لیتے تھے۔ جو رسم و رواج یا رائج قانون ان سے متصادم ہوتا اُن میں تبدیلی کا حکم دیتے تھے۔ ایسے تمام قوانین جن کی شکل گیری میں زمانی و مکانی عناصر کا دخل ہوتا ہے وہ دائمی ہو ہی نہیں سکتے اور انھیں دائمی سمجھنے والوں کو وقت اور سماج کی قوتوں کے مقابلے میں بالآخر شکست ہی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے قوانین روز اول سے دائمی نہیں ہوتے، چاہے ان کا نفاذ کسی نبی کے دور میں ہوا ہو۔

ختم نبوت کا عقیدہ اس پہلو سے یہ سوال سامنے لاتا ہے کہ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اسلامؐ نے جن قوانین کو متعارف کروایا وہ بغیر کسی تبدیلی کے باقی رہیں گے، چاہے حالات کچھ بھی ہو جائیں؟ نیز جو نئے اور پیش آمدہ مسائل ہوں گے اُن کے بارے میں امت اسلامیہ کیا طرز عمل اختیار کرے گی اور دیگر انسانوں کے لیے کیا نمونہ پیش کرے گی؟ اسی سوال کا جواب دینے کے لیے علماء نے اسلام میں اجتہاد کی گنجائش، ضرورت اور حکمت کا راستہ اختیار کیا ہے۔

نظریۂ اجتہاد دراصل نظریۂ ختم نبوت کا لازمہ ہے۔ اسلام میں اجتہاد کی اجازت اور ضرورت کو تسلیم کر لیا جائے تو عقیدۂ ختم نبوت کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ جمود اور حرفیت پسندی کے امکان کی نفی ہو جاتی ہے بلکہ اس سے آخری نبی کی وارث انسانیت کی علمی، عقلی اور فکری استعداد پر اعتماد کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

اس حوالے سے دو باتیں قابل غور ہیں ایک یہ کہ ایسا نبی جسے رہتی دنیا تک کے لیے تمام انسانیت کے لیے اسوہ و نمونہ کے طور پر باقی رہنا ہے اس کے معاشرتی احکام چند غیر متبدل قوانین اور اصولوں کی بنیاد پر ہونے چاہئیں۔(۱۴)

ہر دور اور ہر علاقے کے ہر فرعی مسئلے کے لیے دائمی حکم ایسے نبی کے ہاں سے تلاش کرنا نقلی لحاظ سے درست ہے اور نہ عقلی لحاظ سے۔ اس حوالے سے دوسری اہم بات یہ ہے کہ مختلف ادوار میں مختلف مسائل میں مختلف فقہاء اور ماہرین قانون و شریعت کے استنباطات اور آراء کو شریعت کی حتمی ترجمانی یا شریعت کا دائمی حکم سمجھنا بھی ختم نبوت کے تصور کی نفی ہے۔ کسی فقیہ کا استنباط آج بھی ہمارے لیے مفید اور قابل عمل ہو سکتا ہے لیکن ہمیشہ ہر استنباط اور رائے ضروری نہیں ایسی ہی ہو۔ غور و فکر اور استنباط و اجتہاد کا یہ سلسلہ زمان و مکان کے تقاضوں کے مطابق جاری رہنا چاہیے۔

عقل و وحی باہم مدمقابل نہیں:

بعض سوالات اس فہم ناقص کا نتیجہ ہیں کہ عقل و وحی دو متقابل چیزیں ہیں، دوسرے لفظوں میں یہ باہم متوازی ہیں۔ فلسفے کی اصطلاح میں یہ دونوں ایک دوسری کے عرض میں ہیں حالانکہ قرآن وحدیث کی اس امر

پر واضح شہادتیں موجود ہیں کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے طول میں ہیں بلکہ ہماری رائے میں یہ اصطلاح بھی صورت حال کی مکمل عکاسی نہیں کرتی۔ صحیح صورت حال خود قرآن حکیم اور متعلقہ احادیث سے واضح ہوتی ہیں۔ باب مدینۃ العلم امیرالمومنینؑ کی تعبیر بہت مددگار رہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

فبعث فیهم رسله واتر الیهم انبیاء ،لیستادوهم میثاق فطرته و یذکروهم منسی نعمته ویحتجوا علیهم بالتبلیغ ویثیروالهم دفائن العقول ویروهم الایات المقدرة.(۱۵)

اللہ نے بنی آدم میں اپنے رسول مبعوث کیے اور لگا تار انبیاء بھیجے تا کہ ان سے فطرت کے عہد و پیمان پورے کروائیں، اس کی بھولی ہوئی نعمتیں یاد دلائیں۔ پیغام ربانی پہنچا کر حجت تمام کریں۔ عقل کے دفینوں کو ابھاریں اور انھیں قدرت کی نشانیاں دکھائیں۔

قرآن حکیم میں تفکر، تعقل اور تدبر کی بار بار دعوت اسی حقیقت کی شہادت دیتی ہے۔ نزول قرآن سے پہلے اور بعد کے عربوں کی گفتگو، خطبات اور ادب میں جو انقلابی تبدیلی دکھائی دیتی ہے وہ اسی تفکر و تعقل کی انگیخت کا نتیجہ ہے۔ رسول اکرمؐ کا اپنے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کرنا اور انھیں سوال کی اجازت دینا اسلام کی عقلی اور فروغ عقل کی روش کا غماز ہے۔ انسانی فکری صلاحیتوں کو انبیاء نے حرکت دی ہے اور انبیاء کی تحریک نے انسانی شعور کی بالیدگی اور گہرائی میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ قرآن حکیم آج بھی یہ کردار ادا کرتا ہے اور انسانوں کو مسلسل آیات انفس و آفاق میں غور و فکر پر ابھارتا رہتا ہے۔ انسان کی تمام تر مثبت ترقیوں میں انبیاء کی اسی تحریک کے جلوے کارفرما ہیں۔

اس پس منظر میں ختم نبوت کا اعلان اس امر کی پیش گوئی بھی ہے کہ انبیاء کی تحریک اور قرآن جیسی کتاب کی مسلسل دعوت فکر کے نتیجے میں انسانی شعور کی پیش رفت جاری رہے گی اور معنوی و مادی کمالات کا سلسلہ آگے بڑھتا رہے گا۔

نبی اعلیٰ عقلی وفکری صلاحیت کا مالک ہوتا ہے:

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خود نبی کی حیثیت بھی روبوٹ کی سی نہیں ہوتی۔ وہ اعلیٰ عقلی وفکری صلاحیت کا مالک ہوتا ہے۔ اس کے ملاکات معنوی اور خلوص وللّٰہیت اس پر دانائی، بصیرت اور حکمت کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ وہ آسمانی و کائناتی حقائق کو سمجھنے لگتا ہے بلکہ اُن کا مشاہدہ کرتا ہے۔ جیسے بعض علاقوں میں پہاڑوں کا رُخ، سطح زمین کی سمندر سے بلندی، درختوں اور جنگلات کی کثرت وغیرہ بادلوں کو اپنی طرف کھینچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں نبی کا سینہ بھی الٰہی و آفاقی حقائق کی بارش برسنے کی صلاحیت کا حامل ہوتا ہے البتہ

تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ. (۱۶)

ان رسولوں میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت عطا کی ہے۔

کے مصداق اس حوالے سے انبیاء کے مراتب میں بھی فرق ہوتا ہے۔ نبی ہونے کے لحاظ سے اور صدق و صداقت کا علمبردار ہونے کے اعتبار سے تو اُن میں فرق نہیں ہوتا جیسا کہ قرآن فرماتا ہے

" لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ "(۱۷)

(اور ہم اپنے رسولوں میں سے کسی کے درمیان کوئی تفریق روا نہیں رکھتے)

لیکن درجۂ معرفت میں ضرور فرق ہوتا ہے اور خاتم النبیینؐ ان میں سے بلند ترین منصب پر فائز تھے۔ وہ اپنی عقل وخرد سے بھی دوسروں سے زیادہ اور بہتر کام لیتے تھے اور اپنے پیروکاروں کو بھی اس کی دعوت دیتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اُن کے پیروکار اندھے مقلد بن جائیں۔ وہ انھیں غور وفکر اور سوال پر ابھارتے۔ خود اُن سے سوال کرتے اور اہل علم سے سوال کرنے کی دعوت دیتے۔ جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۱۸)

اہل ذکر سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے ہو۔

نصوص اور اجتہاد:

اس حوالے سے یہ بات کہنا بھی مناسب ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کو غور وفکر سے روکتے ہیں اور اجتہاد کا باب بند کرتے ہیں وہ اسلام کے عظیم مقاصد سے غافل ہیں۔ نیز یہ بات بھی کہنے میں مضائقہ نہیں کہ اجتہاد بمقابلہ نص اور بات ہے اور اجتہاد برائے فہم نص اور بات ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نص ہی کو نہیں بلکہ اُس کی حکمت اور مقصد کو بھی سمجھا جائے۔ جب خود نصوص تفقہ اور تدبر پر اصرار کر رہی ہیں تو نصوص کے وارث کس طرح اس راستے میں حائل ہونے میں حق بجانب ہو سکتے ہیں۔ یہ تو ختم نبوت کے عقیدے کا ایک ناگزیر تقاضا ہے۔

ختم نبوت اور امت محمدیہ ﷺ کی ذمہ داری:

جب ہم ختم نبوت کے اس مفہوم و مقصد کا اعتراف کر لیتے ہیں تو اس کا یہ بھی لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ دور ختم نبوت میں امتِ محمدیہ کو چاہیے کہ اپنے آپ کو نبوت کی وارث سمجھے اور انبیاء الٰہی کی خالص تعلیمات باقی انسانوں تک پہنچائے۔ اہل فقہ واجتہاد سے لے کر ایک عام امتی تک سب پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے، ورنہ باقی انسانوں کی حجت مسلمانوں کے خلاف ہوگی۔ اس ذمہ داری کی طرف قرآن حکیم کی کئی آیات بھی اشارہ کرتی ہیں۔ بعض آیات میں آنحضرتؐ کی نبوت کو عالمینی نبوت قرار دیا گیا ہے۔ بعض آیات سے ظاہر ہوتا ہے

کہ آپ ساری انسانیت کی طرف مبعوث ہوئے ہیں۔ بعض آیات میں صراحت سے فرمایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ آنحضرتؐ سے پیغام لے کر باقی انسانیت تک پہنچائیں۔ جس آیت میں مسلمانوں کو ''امت وسط'' قرار دیا گیا ہے اس کا بھی ایک معنیٰ مفسرین نے یہی کیا ہے کہ یہ امت محمد مصطفیٰ ﷺ اور باقی انسانیت کے مابین واسطہ ہے۔

ایسی تمام آیات ہمارے اسی نظریے کی مؤید ہیں کہ اس دور میں ساری امت آسمانی پیغام کو اپنے فکر و عمل کے ذریعے دیگر انسانوں تک پہنچانے میں مکلّف ہے اگر چہ بقول شاعر:

جن کے رتبے ہیں سوا اُن کو سوا مشکل ہے

اہل علم و فضل کی ذمہ داریاں سوا ہیں اور جوں جوں پایۂ علم و معرفت بڑھتا جاتا ہے ذمہ داری بھی بڑھتی جاتی ہے۔

☆☆☆☆☆

حواشی ومصادر

۱۔ (۵۔مائدہ:۳)

۲۔ (۳۔آل عمران:۱۹)

۳۔ (۱۵۔حجر:۹)

۴۔ اقبال، محمد، علامہ: کلید کلیات اقبال اردو (لاہور: ادارہ اہل قلم، علامہ اقبال ٹاؤن، دسمبر ۲۰۰۵)ص ۳۶۴

۵۔ (۹۴۔انشراح:۴)

۶۔ شیخ مفید، محمد بن محمد بن نعمان عبکری بغدادی (م ۴۱۳ھ): کتاب المزار، تحقیق: باقر ابطحی (بیروت، دار المفید للطباعۃ والنشر والتوزیع، ۱۹۹۳) باب فضل الکوفہ، ص ۶

۷۔ (۳۔آل عمران:۷)

۸۔ نعمانی، محمد بن ابراہیم (م ۳۶۰): کتاب الغیبۃ، تحقیق: فارس حسون کریم (قم، منشورات انوار الہدیٰ، طبع اول، ۱۴۲۲ھ) باب ۴، ص ۹۰، ح ۱۸

۹۔ طوسی، ابی جعفر محمد ابن حسن (م ۴۶۰): الامالی، تحقیق، قسم الدراسات الاسلامیہ، مؤسسہ البعثۃ (قم، دار الثقافۃ، طبع اول، ۱۴۱۴ھ) ص ۳۵۱ قندوزی، شیخ سلمان ابن ابراہیم (م ۱۲۹۴ھ) ینابیع المودۃ، تحقیق: سید علی جمال اشرف حسینی (ایران، دار الاسوۃ للطباعۃ والنشر، طبع اول ۱۴۱۶ھ) ج ۳، ص ۲۷۸، باب ۷۵۔ نیز کلینی، ابی جعفر محمد بن یعقوب (م ۳۲۸/۳۲۹ھ): الکافی (تہران، دار الکتب اسلامیہ، طبع سوئم) ج ۵، ص ۱۲، باب وجوہ الجھاد میں ہے کہ آنحضرتؐ نے صحابہؓ سے سوال کیا کہ کیا تمھیں معلوم ہے کہ جس طرح سے میں نے تنزیل قرآن پر جنگ کی ہے تم میں سے کون تاویل قرآن پر جنگ کرے گا۔ اس پر صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہؐ اللہ اور اُس کا رسول بہتر جانتا ہے۔ حضرت علیؑ جو پاس ہی بیٹھے جوتا گانٹھ رہے تھے آنحضورؐ نے اُن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: یہ جو جوتا گانٹھ رہا ہے۔ نیز دیکھیے خصائل صدوق، ص ۲۷۶

۱۰۔ صفار، محمد بن حسن، م ۲۹۰، بصائر الدرجات، ناشر موسسہ الاعلمی تہران، ایران، طبع ۱۴۰۴ق، ج ۷ باب ۱۷، ح ۳، ص ۳۳۴ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: کافی ج ۱، کتاب الحجۃ باب الاشارۃ والنص علی امیر المومنین، ص ۲۹۴، ح ۱۔ مسند احمد، ج ۳ ص ۱۴، مسند ابی سعید خدری۔ سنن ترمذی، ج ۵، باب مناقب اہل بیت، النبی ص ۳۲۹، ح ۳۸۷۶۔

۱۱۔ حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں قرآن حکیم کی یہ آیت اس حوالے سے ہماری رہنمائی کرتی ہے:

وَ اِذِابۡتَلٰۤی اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ قَالَ لَا یَنَالُ عَهۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ

اور جب ابراہیم کے پروردگار نے بعض کلمات کے ذریعے اُن کا امتحان لیا تو وہ اس میں پورے اُترے (اس کامیابی پر اُس اللہ نے) کہا: ہم تجھے انسانوں کا امام بناتے ہیں۔ وہ کہنے لگے: اور میری اولاد میں سے؟ تو (اُس نے) کہا: میرا یہ منصب ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔ (۲۔ بقرہ:۱۲۴)

اس سلسلے میں سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیمؑ کا امتحان لے رہا تھا تو کیا وہ نبی تھے؟ قرآن حکیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ضرور نبی تھے۔ اُن کا سب سے بڑا امتحان حکم الٰہی سے بیٹے کو ذبح کرنا تھا اور یقیناً اس وقت وہ نبی تھے۔ اس امتحان کی کامیابی کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

وَنَادَیۡنٰهُ اَنۡ یّٰۤاِبۡرٰهِیۡمُO قَدۡ صَدَّقۡتَ الرویا (الصافات،۱۰۳، ۱۰۴)

اور ہم نے ابراہیم کو صدا دے کر کہا: اے ابراہیم! تحقیق تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا۔
ایسے امتحان میں کامیابی کے بعد آپ کو انسانوں کا امام بنایا گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبوت کے علاوہ بھی مقامات بلند موجود ہیں۔

۱۲۔ (۵۶۔ واقعہ:۱۰تا۱۴)

۱۳۔ (۲۔ بقرہ۔۱۱۵)

۱۴۔ امام علی ابن موسیٰ رضا سے منقول یہ روایت اسی امر کی حکایت کرتی ہے:

علینا القاء الاصول الیکم وعلیکم التفریع

ہمارے ذمہ تمھیں اصول بتانا ہے اور تمھارے ذمہ ان سے فروع کا استنباط ہے۔

حلی، ابن ادریس (م ۵۹۸ھ) مستطرفات السرائر (قم، ایران، موسسہ النشر الاسلامی، ط دوم) ص ۵۷۵

۱۵۔ (نہج البلاغہ، خطبہ نمبر ۱)

۱۶۔ (۲۔ بقرہ:۲۵۳)

۱۷۔ (۲۔ بقرہ:۲۸۵)

۱۸۔ (۱۶۔ النحل:۴۳)

☆☆☆☆☆